تہجد اور تربیت نفس☆

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

w

یٰۤاَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ o قُمِ الَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلًا o نِّصْفَهٗۤ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِیْلًا o اَوْ زِدْ عَلَیْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِیْلًا o (المزمل ۷۳:۱-۴)

اے اُوڑھ لپیٹ کر سونے والے رات کو نماز میں کھڑے رہا کرو مگر کم' آدھی رات' یا اس سے کچھ کم کرلو' یا اس سے کچھ زیادہ بڑھا دو' اور قرآن کو خوب ٹھیر ٹھیر کر پڑھو۔

یہ ابتدائی دور کی سورتوں میں سے ہے۔ دوسرا رکوع خاص طور پر معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ طیبہ کا ہے' جو آخر میں نازل ہوا۔ پہلا رکوع ابتدائی دور کا ہے جس زمانے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت فرمائی جارہی تھی۔ لیکن ایسے ابتدائی دور کا نہیں ہے کہ کفار سے کش مکش شروع نہ ہوئی ہو۔ ایک وہ دور تھا کہ جب کفار سے کش مکش شروع نہیں ہوئی تھی۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علانیہ تبلیغ نہیں فرماتے تھے' بلکہ الگ الگ لوگوں سے فرداً فرداً مل کر بات کر کے فضیلت اور معنی بتاتے تھے۔ اس زمانے میں کش مکش میں شدت اختیار نہیں ہوئی تھی۔

جب آپؐ نے علانیہ تبلیغ کرنا شروع کی' اس زمانے میں کش مکش شروع ہوئی۔ اس کش مکش کے زمانے میں اس بات کی ضرورت تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت کی

☆ تفہیم القرآن کی اشاعت کے بعد' سید مودودیؒ کے دروس قرآن کو تحریر کرنے کی عموماً ضرورت محسوس نہیں کی گئی' لیکن درس کا اپنا انداز اور نکات ہیں۔ متعدد درس محفوظ ہیں۔ ایک پیش کیا جارہا ہے۔ (ادارہ)

جائے۔ اس کارِعظیم کے لیے آپؐ کو تیار کیا جائے۔ اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایسے پیارے انداز سے حضورؐ کو خطاب کیا: یٰٓاَیُّھَا الْمُزَّمِّلُ۔

عربی زبان میں اوڑھ لپٹ کر بیٹھ جانے یا لیٹ جانے کو مزمل کہتے ہیں۔ یٰٓاَیُّھَا الْمُزَّمِّلُ کہہ کر خطاب کرنے کے دو مفہوم ہوسکتے ہیں۔ ایک مفہوم یہ ہوسکتا ہے کہ اے شخص جو اطمینان سے پاؤں پھیلائے پڑا ہے' اب تیرے اُوپر بہت بڑے کام کا بار ہے۔ دوسرا مفہوم یہ ہوسکتا ہے کہ اے شخص جو بہت غمگین اور اُداس ہے' اُٹھ کر یہ کام کر۔ گویا ایک آدمی جس کے اُوپر کارِعظیم کا بار ڈال دیا گیا ہے وہ اب پریشان ہے کہ میں اس بار کو کیسے اٹھاؤں اور یہ فریضۂ عظیم کیسے انجام دوں؟ اس پریشانی میں آپؐ لیٹے تھے' یا آپؐ آرام فرما رہے تھے اور اللہ تعالیٰ نے خطاب کیا کہ میاں اَب تمھارے آرام کرنے کا زمانہ گیا' اَب تمھارے اُوپر ایک عظیم الشان کام کا بار ہے۔ اُٹھو اور اَب یہ مشقت کرو۔

اس کے بعد فرمایا کہ:

قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا o نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا o اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا o اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا o (۷۳:۲-۵)

رات کو نماز میں کھڑے رہا کرو مگر کم' آدھی رات' یا اس سے کچھ کم کرلو' یا اس سے کچھ زیادہ بڑھا دو' اور قرآن کو خوب ٹھیر ٹھیر کر پڑھو۔ ہم تم پر ایک بھاری کلام نازل کرنے والے ہیں۔

آدھی آدھی رات کھڑے رہو سے مراد تہجد کی نماز ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بتایا گیا کہ وہ بارِعظیم جو تمھارے اُوپر ڈالا گیا ہے اس کو سنبھالنے کے لیے تمھیں جس طاقت کی ضرورت ہے وہ اس تہجد کی نماز سے حاصل ہوگی۔ یہ وہ چیز ہے جو تمھیں تیار کرے گی۔ اس لیے حکم دیا گیا کہ آدھی آدھی رات کھڑے رہو یا آدھی رات سے کچھ کم یا آدھی رات سے کچھ زیادہ۔

رسولؐ اللہ کا تہجد میں یہ طریقہ رہا کہ جب تک آپؐ کے جسم میں کافی طاقت تھی اُس وقت آپؐ بغیر درمیان میں بیٹھے ہوئے آٹھ رکعتیں مسلسل پڑھتے تھے۔ اس کے بعد بیٹھ کر آدھا تشہد پڑھتے تھے' پھر کھڑے ہوکر ایک رکعت اُس میں اضافہ فرماتے تھے' اور نویں رکعت پڑھنے کے

بعد آپؐ پھر بیٹھ کر پورا تشہد پڑھ کر سلام پھیرتے تھے۔ پھر دو رکعتیں اور پڑھتے تھے۔ اس طرح کہ ۱۱ رکعتیں آپؐ تہجد میں پڑھتے تھے۔ آپؐ کی ہر رکعت طویل ہوتی تھی کیونکہ قرآنِ مجید میں آپؐ کو ترتیل کا سبق دیا گیا ہے۔

ترتیل سے مراد یہ ہے کہ آہستہ آہستہ قرآن مجید کی ایک ایک آیت کو آپؐ بڑے غور سے پڑھا کریں۔ یہاں تک بھی آتا ہے کہ' مثلاً اگر کوئی عذاب کی آیت آ گئی ہے تو آپؐ اس کے اُوپر ٹھیر گئے اور اللہ سے استغفار کیا اور رحم کی درخواست کی۔ کوئی غور وفکر کی دعوت دینے والی آیت آئی تو اس کے اُوپر ٹھیر گئے اور غور وفکر کیا۔ اس طرح آپؐ کی جو تلاوت ہوتی تھی وہ اس نوعیت کی نہیں ہوتی تھی کہ جیسے ہم آج کرتے ہیں' رواں دواں پڑھتے چلے جا رہے ہیں' بلکہ ٹھیر ٹھیر کر' ایک ایک آیت کے اُوپر' ایک ایک لفظ کے اُوپر غور کرتے اور پڑھتے تھے۔ یہ ایسے ہی ہے کہ جیسا مضمون آتا ہے اس کے مطابق اس کے جواب میں بات کرتے ہیں۔ اس طرح سے آپؐ کی ۱۱ رکعتوں میں کئی گھنٹے گزر جاتے تھے۔ بعد میں جب آپؐ کے اندر طاقت کم ہو گئی تو آپؐ نے دو رکعتیں کم کر دیں' یعنی جب بڑھاپا آ گیا تو آپؐ نے نو رکعتیں پڑھنا شروع کر دیں۔

یہاں یہ ہدایت دی گئی ہے کہ تم نماز ٹھیر ٹھیر کر پڑھو' آدھی رات یا آدھی رات سے کچھ کم یا آدھی رات سے کچھ زیادہ۔ اور قرآن مجید کو ترتیل کے ساتھ پڑھو' یعنی آہستہ آہستہ ایک ایک لفظ کو ادا کرو۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس قدر آہستہ آہستہ قرآن پڑھتے تھے کہ اگر کوئی چاہتا تو ایک ایک حرف کو گن سکتا تھا۔ اتنا آہستہ پڑھتے تھے آپؐ۔ کہا گیا کہ ایک بڑے بھاری کلام کا بوجھ تمھارے اُوپر ڈالا گیا ہے۔ اس کو سنبھالنے کے لیے یہ تربیت درکار ہے کہ تم رات کو تہجد پڑھو۔

اب یہ بھاری کلام ایسا تھا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اُوپر اس کا نزول ہوتا تھا تو آپؐ فرماتے ہیں کہ مجھے ایسے معلوم ہوتا ہے کہ جیسے میری جان نکل جائے گی۔ ایک صحابیؓ فرماتے ہیں کہ آپؐ میرے زانو پر زانو رکھ کر بیٹھے ہوئے تھے کہ اس حالت میں وحی آئی تو مجھے محسوس ہوا کہ جیسے میرا زانو ٹوٹ جائے گا۔ ایک اور روایت میں یہ آتا ہے کہ آپؐ ایک اونٹنی پر سوار تھے کہ اس حالت میں آپؐ کے اُوپر قرآنِ مجید کا نزول شروع ہوا تو اونٹنی بوجھ کے مارے بیٹھ گئی

اور تڑپنے لگی۔ یہ نزول وحی کی کیفیت ہوتی تھی۔ اس لیے فرمایا کہ یہ بھاری کلام جو تمھارے اُوپر نازل کیا جا رہا ہے' اس کو سہارنے کے لیے تمھارے اندر جس روحانی قوت کی ضرورت ہے وہ اس چیز کے ساتھ آئے گی۔

بھاری کلام وہ اِس لحاظ سے بھی ہے کہ یہ ایک ایسا کلام تھا کہ اس کے نازل ہونے کے بعد ساری دنیا سے آپؐ کی لڑائی ہوگئی اور وہ دشمنی کے لیے کھڑی ہوگئی۔ آپؐ قرآن کے نزول کے وقت سے لے کر آخری سانس تک عمر بھر کی ایک جدوجہد میں مشغول رہے۔ ہر طرف جاہلیت کا دور دورہ تھا۔ گردوپیش کی تمام طاقتیں سب کی سب آپؐ کے اُوپر ٹوٹ پڑیں۔ گویا یہ ایک بھاری کلام تھا جو اپنے ساتھ بڑی بھاری ذمہ داریاں لے کر آیا تھا۔ ان کو نبھانے کے لیے جس طاقت کی ضرورت تھی اس کے لیے تہجد پڑھنے کی تاکید فرمائی گئی۔

اب مزید وجہ بتائی جاتی ہے کہ یہ تہجد کی نماز تمھارے لیے کیوں ضروری ہے۔

اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْاً وَّاَقْوَمُ قِيْلًا ۝ (۷۳:۶)

درحقیقت رات کا اٹھنا نفس پر قابو پانے کے لیے بہت کارگر اور قرآن ٹھیک پڑھنے کے لیے زیادہ موزوں ہے۔

راتوں کو اُٹھنا یہ بہت زیادہ مؤثر ہے اس بارے میں کہ دل اور زبان کے درمیان موافقت پیدا ہو جائے۔ اس لیے جو آدمی اپنی نیند توڑ کر رات کو اُٹھتا ہے' بالکل اپنی خلوت میں' جہاں کوئی دیکھنے والا نہیں ہے' اُٹھ کر نماز پڑھتا ہے' اور اپنے خدا سے دیر تک خطاب کرتا رہتا ہے' تو یہ بغیر خلوص کے ممکن نہیں۔ جب تک آدمی بالکل مخلص نہ ہو جائے' جب تک اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس کا انتہائی مخلصانہ تعلق نہ ہو' اس وقت تک یہ کام ممکن نہیں ہے۔ آدمی باجماعت نماز میں اور پانچ وقت کی نماز میں ریاکاری کر سکتا ہے' نمایش کی خاطر کر سکتا ہے' اس غرض کے لیے کر سکتا ہے کہ میرا شمار صالحین میں کیا جائے اور میرا لوگوں کے اندر اثر قائم ہو جائے۔ لیکن تہجد کی نماز جو رات کو اُٹھ کر پڑھی جائے' بغیر اِخلاص کے ممکن نہیں۔

اس لیے فرمایا کہ یہ راتوں کو اُٹھنا اس بارے میں سب سے زیادہ مؤثر ہے کہ آدمی کے دل اور اُس کی زبان کے درمیان مطابقت پیدا ہو۔ آدمی کا ظاہر اور باطن یکساں ہو جائے۔ اگر ایک

آدمی یہ عمل کرتا ہے اور اس کے بعد کھڑے ہوکر اللہ کے راستے کی طرف لوگوں کو دعوت دے گا، ظاہر بات ہے کہ یہ اخلاص کی بنیاد پر ہوگا۔ کیونکہ وہ روز اخلاص کی تربیت (training) لے رہا ہے۔ اگر اللہ کے ساتھ اس کا تعلق اخلاص کے ساتھ نہ ہوتو وہ رات کو کیسے اُٹھے۔ رات کو اُٹھ کر وہ اللہ تعالیٰ سے مخلصانہ تعلق کو روز تازہ کرتا رہتا ہے، اس لیے اِس بات کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا کہ وہ اللہ کے راستے میں دعوت دینے کے لیے ریا کاری کرے یا اپنی کسی ذاتی غرض کے لیے، کسی اپنے دنیوی مقصد کی خاطر یہ کام کرے۔ اس طرح آدمی کا ظاہر اور باطن یکساں ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس کے قول اور عمل میں مطابقت پیدا ہوتی چلی جاتی ہے۔ اس کی نیت درست ہوتی چلی جاتی ہے۔

وَّاَقْوَمُ قِيْلًا

اور آدمی کے قول کو زیادہ راست کر دینے والا ہے۔

دوسرے الفاظ میں اس حالت میں جو آدمی دعوت الی اللہ کا کام کرے گا تو وہ کامل راست بازی کے ساتھ کرے گا۔ اس آدمی میں کمال درجے کی راست بازی پیدا ہوجائے گی، جو رات کو اُٹھ کر اپنے آپ کو اخلاص کی ٹریننگ دیتا ہے۔

اِنَّ لَكَ فِى النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيْلًا ○ (۷۳:۷)

دن کے اوقات میں تو تمھارے لیے بہت مصروفیات ہیں۔

یہ ممکن ہے کہ دن کے وقت تمھیں اس طرح کی خلوت کی نماز کا موقع مل جاتا۔ یہ بھی آدمی کرسکتا ہے کہ دن کو اپنے حجرے کے دروازے بند کرے اور دروازے بند کر کے خاموشی کے ساتھ نماز پڑھتا رہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ دن کو تمھارے لیے ایک دوسری مشغولیت ہے جو تمھارا پورا پورا دن لے لینے والی ہے، یعنی تبلیغ کی، دعوت کی، اللہ کے راستے کی طرف بلانے کی۔ لہٰذا تم رات کو ٹریننگ لو اور دن کو پورا وقت اس کام پر صرف کرو کہ اللہ کے راستے کی طرف لوگوں کو بلاؤ۔ تمھارا دن کا وقت اس ٹریننگ کے لیے نہیں ہے۔

وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا ○ (۷۳:۸)

اپنے رب کے نام کا ذکر کیا کرو اور سب سے کٹ کر اُسی کے ہو رہو۔

تبتـــــل اس بات کو کہتے ہیں کہ آدمی سب سے اپنا تعلق توڑ کر ایک طرف کا ہوجائے۔

حضرت فاطمہؓ کے لیے بتول کا لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اپنے سارے تعلقات ختم کرو، ایک اللہ کے ساتھ اپنا تعلق جوڑو۔ اس کے بعد اب جو خلق کے ساتھ تعلق ہوگا وہ اللہ کے واسطے سے ہوگا، براہِ راست نہیں ہوگا۔ بیوی سے تعلق ہے تو اللہ کی خاطر ہے، اولاد سے تعلق ہے تو اللہ کی خاطر ہے، دوستوں سے تعلق ہے تو اللہ کی خاطر ہے، محلے والوں سے تعلق ہے تو اللہ کی خاطر ہے، حتیٰ کہ دشمنوں سے جو تعلق ہے تو وہ بھی اللہ کی خاطر ہے۔ اگر محبت ہے تو اللہ کے لیے اور دشمنی ہے تو اللہ کے لیے۔ کسی قسم کی کوئی ذاتی آلایش اس کے ساتھ نہیں ہے۔ یہ معنی ہیں تبتل کے۔

اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ آدمی سب کچھ چھوڑ کر گوشہ نشین ہو جائے۔ تبتل اس چیز کا نام نہیں ہے کہ آدمی تارک الدنیا ہو کر جنگل میں جا بیٹھے یا پہاڑوں پر چڑھ جائے۔ تبتل اس کا نام ہے کہ آدمی اسی معاشرے میں رہے، انھی لوگوں میں رہ کر کام کرے، اپنی روزی کمائے، دنیا کے تمام تعلقات رکھے، اور ان تعلقات کو رکھتے ہوئے سب سے کٹ کر اللہ کا ہو جائے۔ یہ بہت بڑا کام ہے آدمی کے لیے۔ تارکِ الدنیا ہو کر، بے نیاز ہو کر جنگل میں بیٹھ جانا بڑا آسان ہے۔ لیکن معاشرے کے اندر رہتے ہوئے پھر تبتل کرنا، یہ بہت عظیم الشان کام ہے۔ یہ ہر ایک کے بس کا نہیں ہے۔ اس چیز کی تعلیم اسلام کے سوا کسی اور مذہب میں نہیں ہے۔

دوسرے مذاہب نے جو کچھ سکھایا وہ یہ ہے کہ اگر خدا کے ہونا چاہتے ہو تو خلق سے تعلق توڑو اور جا کر پہاڑوں کے پہلو میں بیٹھ جاؤ۔ جنگلوں میں بیٹھ جاؤ اور وہاں بیٹھ کر تپسیا کرو۔ اسلام نے یہ سکھایا ہے کہ نہیں، تمھارا کام جنگلوں میں نہیں ہے، تمھارا کام انسانوں کے درمیان ہے۔ تم یہاں انسانوں سے تمام تعلقات رکھ کر سارے معاملات چلا سکتے ہو، جس طرح سے کوئی دنیادار چلا سکتا ہے۔ اس لیے اس کے ساتھ تبتل اختیار کرو، سب سے کٹ کر اسی کے ہو جاؤ۔

رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيْلًا ○ (۷۳:۹)

وہ مشرق و مغرب کا مالک ہے، اُس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے۔ لہٰذا اُسی کو اپنا وکیل بنالو۔

وکیل اُس شخص کو کہتے ہیں کہ جس کے اُوپر اعتماد کر کے آپ اپنے معاملات اس کے حوالے

کر دیتے ہیں۔ ہم اپنی زبان میں بھی وکیل اس شخص کو کہتے ہیں جس پر ہم یہ اعتماد کرتے ہیں کہ ہمارا مقدمہ یہ خود لڑے گا۔ اپنا مقدمہ اس کے حوالے کر کے آپ مطمئن ہو جاتے ہیں کہ ہمارے سر سے یہ بلاٹل جائے گی۔ یہاں اسی معنی میں وکیل کا لفظ استعمال کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنا وکیل بنالو۔ جب کہ تم نے اتنا بڑا جھگڑا دنیا میں چھیڑ دیا کہ شرک کے خلاف تم تبلیغ کرنے کھڑے ہو گئے، تمام معبودوں کی تم نے تردید کر دی، تمام جاہلانہ رسموں کی تم مخالفت کرتے ہو، غرض یہ کہ دنیا میں جو کچھ خدا کے قانون کے خلاف ہو رہا ہے، اُن سب سے تم نے اعلانِ جنگ کر دیا ہے۔ اب یہ جنگ مول لینے کے بعد اگر تم اپنی طاقت پر بھروسا کرو تو اس سے بڑی کوئی نادانی نہیں ہو سکتی کہ آدمی دنیا بھر سے جھگڑا مول لے رہا ہو اور بھروسا اس کا اپنی طاقت پر ہو۔ اسی طرح کسی دوسری انسانی طاقت کے بل بوتے پر یا کسی دوسرے بندے کی طاقت کے بل بوتے پر اگر یہ جھگڑا مول لے گا تو تب بھی نادانی کرے گا۔ اس لیے کہ کوئی ایسا طاقت ور نہیں ہے کہ آدمی کو تمام دنیا سے جو اس نے لڑائی مول لے رکھی ہے اور ہر میدان میں لے رکھی ہے ـــــ عقیدے کے میدان میں بھی اور عمل کے میدان میں بھی، معاشرت، سیاست، تمدن اور معیشت غرض ہر چیز کے میدان میں ـــــ اس انسان کا ساتھ دے اور اسے کامیاب کرے۔ کون سی جماعت ایسی ہو سکتی ہے جو اتنی طاقت ور ہو کہ جو اس دنیا بھر سے لڑائی میں اُس کے ساتھ ہو اور مقابلہ کر سکے۔ اس وجہ سے فرمایا کہ جو رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ ہے، جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے، اس کو اپنا وکیل بناؤ۔ پھر یہ لڑائی مول لو اور اس کے اُوپر بھروسا کرو کہ وہ تمھارا خالق ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کھڑے ہوئے تو بالکل اکیلے تھے۔ دنیا بھر میں ایک ہی کی اقلیت سے یہ کام شروع ہوا ہے۔ ایک بندۂ خدا تمام دنیا کے مقابلے میں کھڑا ہو گیا، اور اس کے لیے تیار ہو گیا کہ کوئی نہیں مانے گا تب بھی میں یہ کام کروں گا اور اگر کوئی ساتھ نہیں دے گا تب بھی میں یہ کام کروں گا۔ مجھے ہر حال میں یہ کام کرنا ہے۔ یہ ہمت انسان کے اندر اس کے بغیر پیدا ہی نہیں ہو سکتی کہ اس کا خدا پر بھروسا نہ ہو۔ اپنی طاقت کے بل بوتے پر آدمی یہ کام نہیں کر سکتا۔ کسی بندے کی، کسی انسان کی یا کسی غیر انسان کی طاقت کے بل بوتے یہ کام نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے فرمایا کہ جو مشرق اور مغرب کا مالک ہے اسی پر بھروسا کرو۔

مشرق و مغرب سے مراد محض مشرق اور مغرب نہیں ہے۔ جب ہم کہتے ہیں کہ مشرق اور مغرب کا مالک تو ہماری مراد ساری دنیا کا مالک ہے۔ کیونکہ ساری دنیا مشرق اور مغرب کے درمیان میں ہے۔ لہٰذا جو ساری دنیا کا مالک ہے اور جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے' اسی پر بھروسا کرنا چاہیے۔

جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے کا مطلب صرف یہ نہیں ہے کہ اس کے سوا کوئی پرستش کے قابل نہیں ہے۔ ظاہر بات ہے کہ اگر اس کے سوا کوئی پرستش کرنے کے قابل نہیں ہے تو اِس وجہ سے نہیں ہے کہ کسی کے ہاتھ میں کوئی اختیارات نہیں ہیں۔ انسان کبھی اتنا بے وقوف نہیں رہا ہے کہ کسی کی پرستش بغیر یہ سمجھے ہوئے کرے کہ اس کے اختیارات میں کچھ نہیں ہے۔ اگر کوئی آدمی یہ سمجھے کہ کسی کے اختیار میں کچھ نہیں ہے تو کبھی اُس کی پرستش نہیں کرتا۔ اگر کوئی شخص کسی کے متعلق یہ سمجھتا ہو کہ بیمار ہو گیا ہوں تو کوئی مجھے اچھا کرنے والا نہیں ہے' اگر اولاد نہیں ہے تو کوئی مجھے اولاد دینے والا نہیں ہے' اگر روزگار نہیں ہے تو مجھے روزگار دلوانے والا نہیں ہے' تو ظاہر بات ہے کہ اس کی پرستش کیسے کرنے جائے گا۔ پرستش تب کرنے جائے گا جب یہ سمجھ کر جائے گا کہ مجھے بیماری سے تندرست کرنے والا یہ ہے' رزق دینے والا یہ ہے' مجھے روزگار دلوانے والا یہ ہے' مجھے اولاد دلوانے والا یہ ہے' دنیا میں کامیابیاں دلوانے والا یہ ہے' یا آخرت میں نجات دلوانے والا یہ ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے' اور اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے علاوہ کسی کے ہاتھ میں کچھ نہیں ہے۔ اس کے علاوہ کسی کے ہاتھ میں کوئی اختیارات نہیں ہیں۔ چونکہ سارے اختیارات کا مالک وہ ہے' مشرق و مغرب کا مالک وہ ہے' اِس وجہ سے اِس کو اپنا وکیل بناؤ' یعنی اسی کے سپرد اپنے سارے معاملات کر دو۔

وَاصْبِرْ عَلٰی مَا يَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا ٥ (۷۳:۱۰)

اور جو باتیں لوگ بنا رہے ہیں ان پر صبر کرو اور شرافت کے ساتھ اُن سے الگ ہو جاؤ۔

ھجرِ جمیل کی ایک صورت تو یہ ہے کہ کسی نے آپ کو گالی دی' آپ یہ سمجھ کر کہ میں بے بس ہوں' کمزور ہوں' مقابلہ کیا کروں' غم کا گھونٹ پی کر اور خوب اچھی طرح دل میں روکر' آپ خاموش ہو گئے۔ اس کا نام ھجرِ جمیل نہیں ہے۔ اس کا نام بے بسی ہے۔ ھجرِ جمیل یہ ہے کہ ایک آدمی اِتنا شریف ہو کہ اگر کوئی اُس کو گالی دے تو وہ اس کی ذرا برابر پروا نہ کرے اور اس گالی

کے باوجود اس کے دل میں نیت یہی رہے کہ موقع ملے گا تو اس کو درست کرنے کی کوشش کروں گا۔ اِس وقت یہ غصے میں ہے، اس وقت اس سے مخاطب ہونے کی ضرورت نہیں ہے، کوئی اور وقت آئے گا تو اس کی اصلاح کے لیے کوشش کروں گا۔ اس غرض کے لیے اس کو اس کے حال پر چھوڑ دینا، یہ ھجرِ جمیل ہے۔ اس کے خلاف دل میں میل تک نہ آئے، اس کے خلاف دل میں کوئی غصہ اور کوئی نفرت پیدا نہ ہو۔ یہ سمجھے کہ جیسے ایک بیمار تھا جس نے غصے اور تکلیف کی حالت میں مجھے گالی دے دی۔ فرض کیجیے کہ کوئی بیمار ہو اور بیماری کے دورے کی حالت میں طبیب کو گالی دے تو کوئی عقل مند طبیب غصے میں نہیں آئے گا اور اس سے نفرت پیدا نہیں ہوگی۔ وہ یہ خیال نہیں کرے گا کہ کم بخت نے گالی دی ہے، اچھا! موقع ملے گا تو اسے زہر دے کر مار دوں گا۔ اسے کبھی یہ خیال نہیں آئے گا۔ اگر اس کو کوئی خیال آئے گا تو یہ کہ اس پر سخت دورہ ہے اور وہ اس کے اور زیادہ علاج کی فکر کرے گا۔ لہٰذا ھجرِ جمیل اس چیز کا نام ہے کہ آدمی کے دل میں کوئی غصہ اور کوئی نفرت پیدا نہ ہو۔ اس کے بجائے وہ کمالِ شرافت اور کمالِ خیرخواہی کی بنیاد پر اس کو نظرانداز کر دے۔

وَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ (جو کچھ باتیں یہ لوگ بناتے ہیں، ان پر صبر کرو)، یہ الفاظ خود بتا رہے ہیں کہ یہ اس زمانے کی نازل شدہ سورہ ہے جب لوگوں نے آپؐ کے اُوپر باتیں بنانا شروع کر دی تھیں۔ قرآنِ مجید کے نزول کا زمانہ سمجھنے کے لیے خود قرآن میں کوئی اندرونی شہادت ایسی موجود ہوتی ہے جو یہ بتا دیتی ہے کہ یہ کس دور کی نازل شدہ ہے۔ یہاں یہ الفاظ خود بتا رہے ہیں کہ یہ اس زمانے میں نازل ہوئی، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اُوپر طرح طرح کی باتیں بنائی جانے لگی تھیں۔ کوئی گالیاں دے رہا تھا، کوئی اعتراضات کر رہا تھا، کوئی الزامات اور بہتان چسپاں کر رہا تھا، کوئی طرح طرح سے نبی پاکؐ کے خلاف لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتا پھرتا تھا، کوئی طرح طرح کی تہمتیں جوڑ کر لوگوں کو بدگمان کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسی لیے تو فرمایا گیا کہ وَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ، جو کچھ باتیں یہ لوگ بناتے ہیں، اُن کے اُوپر صبر کرو۔

صبر کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آدمی اپنے گھر بیٹھ جائے۔ صبر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ کام کیے جاؤ جس کی وجہ سے یہ باتیں کر رہے ہیں اور پھر کسی سے جھگڑا مت کرو۔ کسی سے مت اُلجھو۔ جو باتیں وہ بناتے ہیں اُن کو نظرانداز کر دو اور اپنا کام کیے جاؤ۔ صبر کے معنی محض

برداشت کر لینے بھی نہیں ہیں۔ صبر کے معنی یہ ہیں کہ جو کام آپ کو کرنا ہے وہ کام آپ کیے جائیں اور اس کے اُوپر آپ ٹھیریں نہیں۔ صبر کے آخری معنی اپنے آپ کو روک لینے اور ٹھیرانے کے ہیں۔ گویا اس کام کے اُوپر ڈٹے رہو، اس کے اُوپر جمے رہو، اور وہ سب باتیں برداشت کرو جو یہ لوگ آپ کے اُوپر بناتے ہیں۔

یہاں پھر آپ دیکھیے کہ تہجد کے ذریعے نبی پاکؐ کی تربیت کا جو انتظام کیا گیا تھا، اس میں ایک چیز تو یہ پیشِ نظر تھی کہ کامل اخلاص پیدا ہو جائے اور کلام میں راست بازی پیدا ہو جائے اور آدمی کا ظاہر و باطن یکساں ہو جائے۔ دوسری مصلحت یہ بیان کی گئی کہ تمھارے اُوپر ایک ثقیل کلام کا بار ڈالا جانے والا ہے، بہت بھاری کلام کا بار ڈالا جانے والا ہے، اس کو سہارنے کی طاقت تمھارے اندر اس سے پیدا ہوگی۔ تیسری جو ضرورت تھی وہ یہ تھی کہ تمھارے اُوپر جو باتیں چھاپی جا رہی ہیں اس کے لیے صبرِ جمیل کی جو ضرورت ہے، یہ طاقت تمھارے اندر تہجد کی نماز سے پیدا ہوگی۔ تہجد کی نماز تمھارے اندر یہ صلاحیت اور یہ طاقت پیدا کرے گی کہ تمھیں گالیاں دی جا رہی ہیں، تمھارے اُوپر الزامات کی بوچھاڑ کی جا رہی ہے، لیکن تم صبر کے ساتھ اپنا وہ کام کیے جاؤ جو تمھارے سپرد کیا گیا ہے۔ دل میں میل نہیں آتا، دل کے اندر کوئی غصہ اور کوئی نفرت پیدا نہیں ہوتی اور اس کے ساتھ آدمی اصلاحِ قلب کے لیے برابر کام کیے چلا جاتا ہے۔ یہ طاقت اس کے بغیر پیدا نہیں ہوسکتی کہ آدمی اخلاص الی اللہ اور اخلاص فی الدین اپنے اندر پیدا کرے۔ یہ چیز بھی تہجد کی نماز سے پیدا ہوتی ہے۔

وَذَرْنِیْ وَالْمُکَذِّبِیْنَ اُولِی النَّعْمَۃِ وَمَھِّلْھُمْ قَلِیْلًا ○ (۷۳:۱۱)

اِن جھٹلانے والے خوش حال لوگوں سے نمٹنے کا کام تم مجھ پر چھوڑ دو اور انھیں ذرا کچھ دیر اِسی حالت پر رہنے دو۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کا معاملہ میرے سپرد کر دو میں ان سے نمٹ لوں گا۔ فرمایا: اس کو وکیل بنا لو، اور فرمایا کہ تم صبرِ جمیل کرو اور ان کو باتیں کرنے دو، اس کے بعد فرمایا کہ ان کو چھوڑ دو، میں ان سے نمٹ لوں گا، اِن کا معاملہ میرے حوالے کرو۔ گویا تم میرے بھروسے کے اُوپر اپنا کام کیے چلے جاؤ اور اطمینان رکھو کہ میں ان سے نمٹ لوں گا، تمھیں فکر کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔

مکذبین کی صفت یہ بیان کی کہ یہ وہ لوگ ہیں کہ جن کو ہم نے نعمت دی۔ بجاے اس کے کہ ان کے اندر کوئی شکر گزاری کا جذبہ پیدا ہوتا اور وہ اپنے خدا کے سامنے جھکنے والے ہوجاتے، ان کا دماغ خراب ہوگیا ہے۔ یہ بھول گئے ہیں، نمک حرام بن گئے ہیں اور اپنے رب کے مقابلے میں کھڑے ہو گئے ہیں۔ لہٰذا جو اس طرح سے کھاتے پیتے لوگ ہیں اور نعمتیں پانے کی وجہ سے جھٹلا رہے ہیں اِن کو اور مجھے چھوڑ دو، میں ان سے نمٹ لوں گا۔

ذرا مہلت دے دو کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تم اپنے پاس سے ان کو کوئی مہلت دو، بلکہ مراد یہ ہے کہ ذرا انتظار کرو اس بات کا کہ ان کے ساتھ میں کیا معاملہ کرتا ہوں۔ اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ بے چین مت ہو کہ اِن کو جلدی سزا دے دی جائے۔ بسا اوقات آدمی پریشان ہوجاتا ہے، جب دیکھتا ہے کہ چہار سو بندوں پر ظلم ڈھایا جا رہا ہے، خدا کے بندوں کو ستایا جا رہا ہے محض اس لیے کہ خدا کے دین کا کام کرنے والے ہیں۔ پھانسیوں پر ان کو چڑھایا جاتا ہے، جیلوں میں ان کو ٹھونسا جاتا ہے، طرح طرح کی مار ان کو دی جاتی ہے، مگر اس ظالم کا کچھ نہیں بگڑ رہا، تو بڑا بڑا نیک آدمی، بڑا بڑا خدا پرست آدمی، بڑا بڑا صابر آدمی بھی ایک مرتبہ تو پریشان ہوجاتا ہے کہ یا اللہ یہ کیا معاملہ ہے؟ یہ کیا ہو رہا ہے؟ حضرت موسٰیؑ تک نے یہ کہہ دیا کہ یا اللہ فرعون کو برابر نعمتیں ملی چلی جا رہی ہیں، اس کا زور بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے، اس کو دنیا کی زینتیں دی چلی جا رہی ہیں، حالانکہ یہ دنیا پر ظلم ڈھا رہا ہے۔ چونکہ اس طرح کی صورتِ حال کو دیکھ کر انسان بے صبرا ہوجاتا ہے تو فرمایا کہ مَہِّلْهُمْ قَلِيْلًا، ذرا اِن کو مہلت تو دو تم، بے چین مت ہو اس بات کے لیے کہ یہ ظلم ڈھا رہا ہے تو جلدی سے اس کو ختم کر دیا جائے۔ اب اس مہلت میں جو اللہ تعالیٰ دیتا ہے، بے شمار مصلحتیں ہوتی ہیں جن کو کوئی نہیں جانتا۔

اب دیکھیے، مثال کے طور اگر اس ابتدائی زمانے میں، جب لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ظلم ڈھا رہے تھے اور آپؐ کے خلاف طرح طرح کا جھوٹا پروپیگنڈا کر رہے تھے، اگر اسی زمانے میں عذاب نازل ہوجاتا تو یہ خالد بن ولید کہاں سے آتے؟ یہ بڑے بڑے مجاہدین جو اُسی شہر سے پیدا ہوئے ہیں، وہ کہاں سے آتے اگر اسی وقت عذاب نازل کر دیا جاتا؟ اگر مسلمانوں نے تمام ظلم وستم کے مقابلے میں صبر نہ دکھایا ہوتا، اس کے مقابلے میں ڈٹے نہ رہتے، ہر قسم کی تکلیف کا

مقابلہ نہ کرتے' خداپرستی پر قائم نہ رہتے تو ان کے اندر وہ زبردست روحانی طاقت کہاں سے پیدا ہوتی جس سے انھوں نے دنیا بھر کو فتح کیا۔ وہ عزم کیسے پیدا ہوسکتا تھا؟ اسی طرح سے اگر کفار کو ظلم کا موقع نہ دیا جاتا اور مسلمانوں کو اس کے مقابلے میں صبر اور صبرِ جمیل کا موقع نہ دیا جاتا تو سارا عرب کیسے قائل ہوجاتا کہ یہ گروہ واقعی دنیا کا نہایت نیک گروہ ہے' اور سارا عرب کیسے اس کا حامی ہوتا چلا جاتا؟ لہٰذا اللہ تعالیٰ کی بے شمار مصلحتیں ہوتی ہیں کہ جس کی وجہ سے وہ کسی گروہ کو جو ظالم ہے' دنیا میں برائی پھیلانے والا ہے' اس کو مہلت دیتا ہے۔ لیکن ان مصلحتوں کو آدمی سمجھ نہیں سکتا۔ جس وقت وہ کام ہو رہا ہوتا ہے اُس وقت آدمی کی سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ آگے چل کر اس سے کیا خیر پیدا ہونے والی ہے؟ آدمی یہ سمجھتا ہے کہ یہ تو شر ہی شر ہو رہا ہے۔ حالانکہ شر اس کائنات میں جہاں کہیں بھی ہے' کسی خیر کی خاطر ہے' بجائے خود شر کی خاطر نہیں۔

اِنَّ لَدَيْنَآ اَنْكَالًا وَّجَحِيْمًا o وَّطَعَامًا ذَا غُصَّةٍ وَّعَذَابًا اَلِيْمًا o يَوْمَ تَرْجُفُ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ وَكَانَتِ الْجِبَالُ كَثِيْبًا مَّهِيْلًا o (۷۳:۱۲-۱۴)

ہمارے پاس (ان کے لیے) بھاری بیڑیاں ہیں اور بھڑکتی ہوئی آگ اور حلق میں پھنسنے والا کھانا اور دردناک عذاب۔ یہ اُس دن ہوگا جب زمین اور پہاڑ لرز اُٹھیں گے اور پہاڑوں کا حال ایسا ہوجائے گا جیسے ریت کے ڈھیر ہیں جو بکھرے جارہے ہیں۔

یعنی وہ سزا جس کے لیے ہم کہہ رہے ہیں وہ سزا ہمارے پاس تیار ہے۔ ایسا ہوجائے گا جیسے ریت کے ڈھیر ہیں جو بکھرے جارہے ہیں۔ ایسے مواقعوں پر بالعموم قرآن مجید نے دنیوی عذاب کا کہیں ذکر ہی نہیں کیا ہے۔ کثرت سے ایسے مقامات ہیں کہ جہاں ظالموں کے ظلم کے مقابلے میں صبر کا مشورہ دیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ عالمِ آخرت میں اِن کے لیے ہمارے ہاں یہ سزا موجود ہے۔ بعض مقامات پر دنیوی عذاب کی دھمکی دی گئی ہے' بعض مواقع پر خبر دی گئی ہے کہ ان کے اُوپر اب دنیا میں عذاب ہوگا' لیکن ایسے مواقع کم ہیں۔ زیادہ تر مواقع وہ ہیں کہ جہاں یہ بتایا گیا ہے کہ اِن ظالموں کے ظلم پر صبر کرو اور اِن کے لیے آخرت میں قیامت کے روز ہمارے ہاں یہ سزا تیار ہے۔

اِس کی مصلحت پر غور کیجیے کہ یہ بات کہی کیوں گئی ہے؟ یہ بات اس لیے کہی گئی ہے کہ

ضروری نہیں ہے کہ ہر ظالم کے اُوپر اس دنیا ہی میں عذاب آجائے۔ تاریخ بھی بتاتی ہے' یہ انسانی مشاہدہ بھی ہے کہ ہر ظالم پر دنیا میں ہمیشہ عذاب نہیں آسکتا۔ اگر دنیا میں کسی ظالم قوم پر کبھی عذاب آیا بھی ہے تو اُن لوگوں پر آیا ہے جو اس وقت موجود تھے۔ اس گھڑی سے ایک منٹ پہلے جو آدمی مر چکا تھا اُس پر کبھی کوئی عذاب نہیں آیا۔ اس لیے اصل عذاب وہ ہے جو ظالموں کو آخرت ہی میں دیا جائے۔

دوسری مصلحت اس میں یہ ہے کہ آدمی اس غرض کے لیے بیٹھ کر بے چین نہ ہو کہ جو لوگ ہم پر ظلم کر رہے ہیں' اُن پر دنیا میں عذاب آئے گا۔ اور اس بھروسے کے اُوپر کہ دنیا میں اُن پر عذاب آئے گا' ان کو مہلت نہ دیں اور صبر نہ کریں اور نہ یہ ہی سمجھیں کہ یہ جیتے جی ساری عمر بھی ظلم کرتے رہے تو تب بھی کچھ نہیں بگڑتا' آخر کار آخرت میں ان کی شامت آنی ہے۔ مسلمان کو جس صبر کی تلقین کی گئی ہے اس میں نیکی کا اجر بھی اصل وہ ہے جو آخرت میں ملے گا نہ کہ وہ جو دنیا میں ملے گا۔ اتنا صبر مسلمان میں ہونا چاہیے کہ عمر بھر وہ نیکی کرتا رہے' چاہے اُس نیکی کا نتیجہ اُس کے حق میں اِس دنیا میں' عمر بھر برا نکلتا رہے' اُس نیکی کی وجہ سے عمر بھر ستایا جاتا رہے' عمر قید اس کو دے دی جائے یا کوئی بھی ظلم وستم اُس کے اُوپر کیا جائے' تب بھی وہ اس یقین کے اُوپر صبر کر سکے کہ بہر حال آخرت میں میرا اجر یقینی ہے۔ جب تک کوئی شخص آخرت تک کے لیے صبر کرنے پر تیار نہ ہو' وہ اس دین کے راستے پر نہیں چل سکتا۔

اسی طرح سے ظالموں کو سزا دینے کے معاملے میں بھی قرآن جس چیز کا اطمینان دلاتا ہے وہ یہ ہے کہ چاہے اس دنیا میں وہ پھلتے پھولتے رہیں' مگر آخرت میں اُن کی شامت آکر رہے گی۔ بہت سے ظالم ایسے ہیں کہ جو مرتے وقت تک ظلم کرتے رہتے ہیں' مثلاً اسٹالن آخر وقت تک اس کا اعتبار قائم رہا اور مرتے مرتے وہ ڈکٹیٹر بنا رہا' اور مرتے مرتے وہ خلق خدا پر ظلم ڈھاتا رہا' اس دنیا میں اس کی کوئی شامت نہیں آئی۔ اگر کوئی شخص اسی دنیا کے اُوپر انحصار کرنے والا ہو اور آخرت کا قائل نہ ہو تو وہ یہ سمجھے گا کہ یہ سارا نظامِ کائنات ظلم کے لیے بنا ہے کہ ایک شخص عمر بھر ظلم کرتا رہا اور مزے سے ٹانگیں پھیلا کر مر گیا' اور اس بات کی کوئی سزا اُسے دنیا میں نہیں ملی۔ دنیا کو ایک عادل خدا کی مملکت ہونے کا یقین اُسی آدمی کو ہوسکتا ہے جس کو یہ یقین ہو کہ اس دنیا سے اگر ظالم

گزر بھی گیا تو آخرت میں اُس کی شامت آنی ہے۔ لہٰذا ایک مسلمان کو یہاں جو صبر کی تلقین کی گئی ہے، یہ وہ صبر ہے کہ جو دنیا کے اندر آخرت تک انتظار کر سکتا ہو۔ دنیا کے لیے بے چین نہ ہو کہ دنیا ہی میں اس کو اجر بھی مل جائے اور دنیا ہی میں ظالم کو بھی سزا مل جائے۔ (جاری)

(کیسٹ سے تدوین: امجد عباسی)